دینی مدارس کا نصابِ درس، تاریخی حقائق اور تقاضے

A Critical Study of Deeni Madaris and their curriculum

Dr.M. kashif Shaikh*

Abstract

Deeni Madaaris played a vital role in promotion of Islamic sciences as dominated centers of all Muslim societies as well as in Subcontinent. Unfortunately there are some misconceptions which have been established throughout the world from last decades. Besides these extraneous elements, there is also a desire for a change, coming from Madaris themselves which should welcome by the concerning bodies. In this sense it is needed to present the real picture of Deeni Madaaris regarding their historical background, curriculum and environment to assess and evaluate their contribution towards fulfillment of their foundation purpose.The present paperprovides a brief list ofsuggested reforms in DeeniMadaris in Pakistan as well.

Keywords: Madaris, curricalum, History

ارشاد باری تعالیٰ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا[1] کے مصداق اسلام میں علم کا سرچشمہ اور منبع حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ دنیا میں جتنا علم ہے اور علوم و فنون کے میدان میں جو بھی ترقی ہوئی ہے وہ فی الواقع اللہ تعالیٰ کی انسان کو عطا کردہ سوچنے، سمجھنے، غور و فکر کرنے اور تحقیقات و تجربات کے ذریعے نت نئے انکشافات اور ایجادات کی صلاحیت کے طفیل ہے۔ مسلمان علم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم نعمت سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مسلمان تعلیم و تعلم کو مغرب کی طرح تجارتی پیشہ نہیں بلکہ عبادت سمجھتے رہے ہیں اور مسلمانوں نے دعوت دین کی مانند کبھی فروغ علم کے معاملے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ مسلمانوں کے دروازے تمام مذاہب کے پیرکاروں کے لیے حصول علم کی غرض سے یکساں طور پر کھلے رہے ہیں۔

عہد رسالت مآب ﷺ میں علوم و فنون کی ترقی

نبی اکرم ﷺ کے عہد میں یکساں نظام تعلیم، تخصصات(Specialization) مختلف زبانوں اور مہارتوں(Skills) کے فروغ کے لیے اقدامات کیے گئے جن کی تفصیل کتب حدیث میں ملتی ہے۔ نصاب میں تنوع اور جامعیت کے حوالے سے ہمیں روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں قرآن و سنت کے علاوہ

* Chairmen Department of Islamic Studies, Riphah International University, Islamabad

1-البقرہ ۲: ۳۱

تقسیم ترکہ کی ریاضی[2]، مبادی طب[3]، علم ہیئت، علم انساب[4] اور علم قرأت و علم تجوید[5] کے حصول کی ترغیب دی گئی۔ نبی اکرم ﷺ نے خواتین کی تعلیم کے لیے ہفتے میں ایک دن علیحدہ مقرر کیا تھا[6]۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فقہ و دیگر اسلامی علوم نیز ادب، شاعری، انساب عرب اور طب وغیرہ پر دسترس رکھتی تھیں۔[7] حضور اکرم ﷺ کی زیر نگرانی نشانہ بازی، تیراکی اور گھڑ سواری وغیرہ کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔[8] آپ ﷺ سے مختلف علوم میں تخصص کا درجہ رکھنے والے صحابہ کرامؓ سے تعلیم حاصل کرنے کے ارشاد بھی مروی ہیں۔[9] سرور کونین ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو جو کہ پہلے ہی فارسی اور رومی (یونانی) زبانیں جانتے تھے، عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا تھا تاکہ عبرانی زبان میں خطوط وغیرہ لکھنا پڑھنا سیکھ لیں۔[10] اسلامی ریاست کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو مترجمین (Translators) کی ضرورت ہوا کرتی تھی تاکہ مختلف ممالک کے حکمرانوں اور مختلف اقوام و قبائل کے سرداروں کے ساتھ معاملات میں آسانی رہے۔

مسلمانوں کا دور عروج اور یکساں نصاب تعلیم

کئی صدیوں پر محیط مسلمانوں کے دور عروج میں ان کے نصاب تعلیم میں کسی قسم کی تفریق اور ثنویت نہیں پائی جاتی تھی۔ یکساں نظام تعلیم رائج تھا اور دین و دنیا کی ہر قسم کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ایک تعلیمی نظام سے استفادہ کافی سمجھا جاتا تھا۔ ایک ہی استاد امام جعفر صادقؒ کے شاگردوں میں علم فقہ کے عظیم امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ بھی تھے اور جابر بن حیانؒ جنہیں علم کیمیا کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے، ان کا شمار بھی امام جعفر صادقؒ کے شاگردوں میں ہوتا ہے[11]۔

2- محمد بن عیسیٰ ترمذی، جامع ترمذی، باب ماجاء فی تعلیم الفرائض، (دارالسلام ریاض ۲۰۰۰ء) ح ۲۰۹۱
سنن ابن ماجہ ابواب الفرائض باب الحث علیٰ تعلیم الفرائض، حدیث نمبر: ۲۷۱۹، (دارالسلام، ریاض ۲۰۰۰ء) مسند امام احمد، حدیث العرباض بن ساریہؓ، ح: ۱۶۷۰۲

3- دیکھئے کتب حدیث میں ابواب الطب نیز بغیر تعلیم طب کے علاج کی ممانعت کے لیے دیکھئے: سنن ابن ماجہ، ابواب الطب باب من تطبب و لم یعلم منه طب، (دارالسلام، ریاض ۲۰۰۰ء) ح ۳۴۶۶

4- جامع الترمذی کتاب البر و الصلة ،باب ما جا فی تعلیم النسب، (دارالسلام ریاض ۲۰۰۰ء) ح: ۱۹۷۹

5- محمد بن اسماعیل البخاری، الصحیح، باب مناقب سالم مولی ابی حذیفہؓ، (دار السلام ریاض ۲۰۰۰ء)، ح: ۳۷۵۸۔ جامع الترمذی ابواب المناقب باب مناقب معاذ بن جبلؓ و زید بن ثابتؓ و ابی بن کعبؓ و ابی عبیدہ بن الجراحؓ، ح: ۳۷۹۰

6- محمد بن اسماعیل، الصحیح کتاب العلم باب هل یجعل النساء یوم حدة فی العلم، ح: ۱۰۱

7- التراتیب الاداریہ (القسم العاشر) محمد عبدالحئی الکتانی (مترجم اردو) (کتب خانہ سیرت کراچی ۲۰۰۷ء) ص ۳۳۸-۳۳۷۔

8- سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی الرمی، (دارالسلام ریاض ۲۰۰۰ء) ح ۲۵۱۳۔

9- صحیح البخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب سالم مولی ابی حذیفہؓ، حدیث نمبر ۳۷۵۸۔ جامع الترمذی ابواب المناقب باب مناقب معاذ بن جبلؓ و زید بن ثابتؓ و ابی بن کعبؓ و ابی عبیدہ بن الجراحؓ، حدیث نمبر: ۳۷۹۰ / صحیح مسلم کتاب الامارۃ، باب فضل الرمی، (دارالسلام ریاض ۲۰۰۰ء)، ح: ۴۹۴۹

10- غلام جیلانی برق، ڈاکٹر، فلسفیان اسلام، تذکرہ جعفر امامؒ، (لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن،) ص ۸۲

11- ڈاکٹر حفیظ الرحمان، صدیقی، دنیائے اسلام میں سائنس و طب کا عروج، (نشریات لاہور ۲۰۰۶ء)، ص ۱۱

علامہ ابن رشدؒ نے ارسطو کی کتابوں کی شرح بھی کی ہے اور علم فقہ میں ''ہدایۃ المجتہد'' نامی یادگار کتاب بھی انہی کے قلم سے صادر ہوئی ہے۔امام رازیؒ ابن سینا کے فلسفہ کی تشریح بھی کرتے تھے اور وہ معرکۃ الآراء تفسیر ''تفسیر کبیر '' کے مؤلف بھی ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے پورے دور عروج میں دینی و دنیاوی علوم کے لیے یکساں نصاب کا اجراء کر کے تعلیمی نظام میں ایسی وحدت پیدا کر دی تھی کہ برصغیر میں ایک زمانہ وہ بھی گزرا ہے کہ دیگر مذاہب کے ماننے والے بھی پڑھنے لکھنے کے لیے اسی نصاب کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔[12]

باضابطہ دینی مدارس کے قیام کے دور میں سب سے نمایاں حیثیت مشہور سلجوقی وزیر نظام الملک طوسی (م ۴۸۵ھ) کے قائم کردہ مدرسہ نظامیہ بغداد کو دی جاتی ہے۔اسی مدرسہ سے ابو اسحاق شیرازیؒ، امام غزالیؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جیسی نابغہ روزگار دینی و روحانی شخصیات وابستہ رہیں۔

اس جامعہ میں علوم قرآن کے علاوہ علم افلاک، علم نباتات، علم الحیوانات وغیرہ کا درس ہوتا تھا۔یہی وہ عہد ہے جس میں مصر کی فاطمی حکومت نے جامعہ ازہر قائم کیا۔[13] برصغیر پاک و ہند میں صدیوں سے اسی طرز پر تعلیم دی جاتی رہی ہے۔دین، معاشرت، حکمت، فلسفہ اور ادب سے متعلقہ جملہ علوم کے ماہرین ایک ہی نظام تعلیم سے تیار ہوتے رہے ہیں۔ذیل میں دی گئی فہرست مختلف علوم کو حاصل کر کے تیار ہونے والے متنوع اور جامع الصفات ماہرین پر مشتمل ہے جس سے اس دور کے نظام تعلیم کی ہمہ گیریت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

علوم دین: مفسر، محدث، اصولی، فقیہ، قاضی، مفتی، صوفی، سوانح نگار علما (عربی و فارسی وغیرہ) سوانح نگار صوفیا، ماہرین تعلیم، جامع العلوم، مصلحین، مناظرین تقابل ادیان۔علوم معاشرت: وزیر اعظم، سپہ سالار، مؤرخین عربی، فارسی اردو وغیرہ) قومی سوانح نگار، گزیٹر نویس، دائرۃ المعارف نویس، ماہرین کتابیات، جغرافیہ دان، مغربی ممالک کے سیّاح، مغربی زبانوں کے ماہرین، صحافی۔

علوم حکمت: فلسفی، ماہرین فلکیات، ریاضی دان، مہندس مساحت (انجینئر) معمار، صناع، اطبا۔

علوم ادب: عربی شعراء و لغت نویس، فارسی شعراء و لغت نویس، خوش نویس، کتب نویس، اردو شعراء، لغت نویس و ادیب، تذکرہ نویس، مکاتیب نویس، شعراء ہندی بھاشا، خطباء و مقررین۔[14]

برصغیر پاک و ہند میں نصاب درس کی تاریخ کافی طویل ہے۔پاکستان میں دینی مدارس کے موجودہ امتحانی بورڈز کے قیام کے بعد کا دور مدارس کی تاریخ میں نئے دور کے نقطہ آغاز کے طور پر یادگار رہے گا۔ قبل ازیں اور بالخصوص قیام پاکستان سے پہلے برصغیر کی اسلامی علوم کی تاریخ میں نصاب درس کو مختلف ادوار اور مراحل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تمام ادوار کے نصابات میں سب سے زیادہ شہرت لکھنؤ سے ۲۸ میل کے فاصلے پر آباد قصبے سہالی کے ملّا قطب الدین شہید کے بیٹے ملّا نظام الدین سہالویؒ (م: ۱۱۶۱ھ □ ۱۷۴۷ء) کے تشکیل دیے ہوئے نصاب درس کو حاصل ہوئی۔

12-مناظر احسن، گیلانی، پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، (لاہور، دوست ایسوسی ایٹس ۲۰۰۳ء)، حصہ اول، ص ۲۶۱-۲۶۰،

13-سید سلمان حسنی، ندوی، ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ (مجلس نشریات اسلام کراچی ۲۰۰۴ء)، ص ۸۶-۸۵

14-سید محمد سلیم، پروفیسر، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان لاہور ۱۹۹۳ء، ص ۱۶- ۲۶

ملّا نظام الدین سہالوی کا درس نظامی گیارہ علوم اور تینتالیس کتب پر مشتمل نصاب درس تھا۔ جس میں سب سے زیادہ معقولات پر بیس کتب تھیں جن میں آٹھ منطق، تین حکمت، چار کلام اور پانچ ریاضی سے متعلق تھیں۔ لسانیات پر چودہ کتب جن میں سات علم صرف، پانچ نحو اور بلاغت پر دو کتابیں تھیں۔ اس نصاب درس میں شریعات یعنی مقصود بالذات علوم پر صرف نو کتابیں شامل کی گئی تھیں۔ فقہ پر دو، اصول فقہ پر چار، تفسیر پر دو اور حدیث پر صرف ایک کتاب مشکوۃ المصابیح شامل کی گئی تھی۔[15]

قدیم درس نظامی کے بارے میں دی گئی تفصیل سے یہ تو واضح ہو گیا کہ یہ نصاب درس دین و دنیا کا جامع نصاب تھا اس میں جملہ علوم و فنون کو ایسے طریقے پر شامل کیا گیا تھا کہ اس سے ہمہ جہت صفات اور صلاحیتوں کے حامل رجال کار معاشرے کو میسر آ سکیں اور معاشرہ طبقاتی تفریق و تقسیم سے بھی محفوظ رہ سکے۔ درس نظامی پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ رقمطراز ہیں:

> حکومتِ مسلّط سے قبل مسلمانان ہند میں تعلیم کا جو نظام قائم تھا۔ عام طور پر درس نظامیہ کے نام سے جسے شہرت حاصل ہو گئی ہے اس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں کہ وہ مسلمانوں کے صرف دینی تعلیم کا نظام تھا۔ در حقیقت اس نصاب میں اس عہد کی دفتری زبان فارسی کی نظم و نثر و انشاو غیرہ کی بیسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب خطاطی وغیرہ کی مشق کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم عربی زبان کی کتابوں کے ذریعے دی جاتی تھی، ابتدا سے آخر تک اس زمانہ کے تعلیمی نصاب کی ختم کرنے کی مدت پندرہ سولہ سال سے کم نہ تھی، اور اس پوری مدت تعلیم میں درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے علما صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھا کرتے تھے (یعنی جلالین، شرح وقایہ، ہدایہ یا چار کتابیں بشمول تفسیر بیضاوی)۔۔۔ان چار کتابوں کے سوا تعلیم کی اس طویل مدت میں طلبہ جو کچھ پڑھتے تھے ،فارسی (یعنی دفتری زبان) کی مذکورہ بالا بیسیوں کتابوں کے سوا منطق، فلسفہ، ہیئت، اقلیدس، عربی ادب اور بعض ایسے عقلی و ادبی علوم جنہیں خود مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا (یعنی علم کلام، علم اصول فقہ، معانی بیان وغیرہ) ان ہی علوم و فنون کی اتنی کتابوں کا ختم کرنا ضروری تھا۔ جن میں صرف منطق اور فلسفہ کی کتابوں کی تعداد آخر زمانہ میں چالیس پچاس سے متجاوز تھی۔[16]

برطانوی استعمار اور مسلمانوں کے نظام تعلیم کا خاتمہ

برصغیر میں کئی صدیوں تک مسلمانوں کا یکساں نظام تعلیم اپنے اثرات و ثمرات سے فیض یاب کرتا رہا تا آنکہ ۱۰۱۰ھ۔۱۶۰۱ء میں انگریزوں نے ہندوستان سے تجارت کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی جس نے رفتہ رفتہ پورے برصغیر پر اپنا تسلّط قائم کر لیا۔ کمپنی کی تعلیمی پالیسی کا واضح مقصد انگریزی زبان اور مغربی علوم کو ہندوستان میں رائج کرنا تھا تا کہ برصغیر کے لوگ مغربی تہذیب اور مذہب کو قبول کر لیں۔ حکومت اور عوام میں رابطہ کا کام دینے والے کلرکوں کی تیاری

15- بختیار حسین صدیقی، پروفیسر، برصغیر پاک و ہند کے قدیم عربی مدارس کا نظام تعلیم، (ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔۲۰۰۹ء)، ص ۲۱

16- مناظر احسن، پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت،، حصہ دوم، ص ۷-۶

اوران کی فراہمی تک مسلمانوں کے نظام تعلیم کو بامر مجبوری گوارا کرنااور بالآخر اسلامی نظام تعلیم اور فارسی و عربی زبانوں کی اہمیت کو ختم کر کے انگریزی کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنانا کمپنی کی تعلیمی پالیسی کا حصہ تھا۔

۱۲۵۱ھ □ ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کی رسوائے زمانہ قرارداد کی منظوری کے ذریعے قدیم نظام تعلیم کو یکسر ختم کر دیا گیا۔ یہ قرارداد پانچ نکات پر مشتمل تھی:

۱۔ سرکاری تعلیم کا مقصد ہندوستان میں مغربی علوم وسائنس کی اشاعت ہے۔

۲۔ آئندہ سے ملک کی سرکاری زبان انگریزی ہو گی۔

۳۔ علوم وفنون کی تدریسی زبان بھی انگریزی ہو گی۔

۴۔ مشرقی علوم کی اشاعت پر آئندہ سے کوئی پیسہ خرچ نہیں کیا جائے گا۔[17]

برطانوی عہد میں برعظیم کی تاریخ تعلیم کا پہلا دور لارڈ میکالے کی پیش کردہ قرارداد (۱۸۳۵ء) پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے قبل کا دور کسی نہ کسی حد تک بہر حال مشرقی علوم وادبیات کا دور کہا جا سکتا ہے، جس میں انگریزوں نے ہندوستانی زبانوں اور ادبیات کی قدرے سرپرستی کی اور چند ادارے ان کی تعلیم وتدریس کے لیے قائم کیے۔

ولیم ہنٹر (W.Hunter) اپنی حکومت کی تعلیمی پالیسی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''اپنی حکومت کے ابتدائی ۷۵ سالوں میں ہم اس نظام تعلیم (اسلامی نظام تعلیم) سے استفادہ کرتے رہے تاکہ انتظام چلانے والے افراد تیار ہوتے رہیں، اس عرصہ میں ہم نے اپنی عوامی تعلیم کی اسکیم بھی جاری کر دی تھی۔ جب اس جدید تعلیم سے ایک نئی نسل تربیت پا کر تیار ہو گئی تو ہم نے اسلامی نظام تعلیم کو دور پھینک دیا۔ اب مسلمانوں نوجوان زندگی کے تمام راستے اپنے لیے مسدود پاتا ہے۔''[18]

انگریزوں نے صدیوں سے قائم اسلامی نظام تعلیم کے خاتمے کے لیے جامع منصوبے پر عملدرآمد کیا۔ اس منصوبے میں طے کیا گیا تھا کہ مدارس سے لوگوں کو بدظن کیا جائے۔ ان مدارس سے فارغ شدہ طلبہ پر رزق کے دروازے بند کر دیے جائیں اور ان مدارس کے ذرائع آمدنی پر حکومت قابض ہو جائے۔

برطانوی استعمار کے مقابلے کی حکمت عملی

برصغیر پر برطانوی استعمار کے قبضے اور مسلمانوں کے کئی صدیوں سے قائم یکساں نظام تعلیم کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کی جانب سے مقابلے کے لیے جو دفاعی حکمت عملی اختیار کی گئی تھی وہ اس دور کے تقاضوں کے مطابق کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہزارہا مسلمان اور مجاہدین ملت کام آئے اس ہنگامے کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو ضلع سہارنپور کے قصبے دیوبند میں دارالعلوم قائم کیا۔ اس دارالعلوم کا بنیادی اصول حکومتِ وقت سے

17، سید محمد سلیم، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ص، ۲۲۰

18- سید محمد سلیمؒ، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص ۲۰۲

لا تعلقی قرار پایا۔ دارالعلوم دیوبند اسلامی علوم کی قدیم طرز کی درس گاہ ہی نہیں بلکہ احیائے اسلام و قیام ملت کی ایک عظیم الشان تحریک ثابت ہوا۔ دارالعلوم دیوبند کے مقاصد قیام قدیم دستور اساسی کے مطابق جو بیان کیے گئے ان میں قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد و کلام اور ان علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنون آلیہ کی تعلیم، مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہنچانا، رشد و ہدایت اور تبلیغ کے ذریعے اسلام کی خدمت سرانجام دینا شامل ہے۔ ان مقاصد میں یہ بات بھی شامل کی گئی تھی کہ حکومت کے اثرات سے اجتناب واحتراز اور علم و فکر کی آزادی کو برقرار رکھا جائے گا۔[19]

ان مقاصد میں دارالعلوم دیوبند کس قدر کامیاب ہوا اس کا اندازہ ان اعداد و شمار سے لگایا جاسکتا ہے جو دارالعلوم کی ابتدائی سو سال کی کارکردگی کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔

> ''دیوبند نے اپنے قیام سے سو سال کی مدت میں تقریباً سترہ ہزار مشائخ طریقت، مدرس، خطیب، مبلغ، مفتی، مناظر، مصنف، صحافی، طبیب اور ماہرین صنعت و حرفت پیدا کیے ہیں۔ ان میں سے اعلیٰ درجے کے اصحاب علم فن کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد ڈھائی ہزار کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ سو سال کی مدت میں ابنائے دیوبند نے تقریباً نو ہزار مدرسے ہندوستان، پاکستان اور بیرون ملک قائم کیے۔''[20]

مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا قیام

دارالعلوم دیوبند کی صورت مسلمانوں میں دینی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب و تمدن کے احیا کی کوشش کی گئی اور اس کے لیے انگریزی سرکار اور انگریزی تعلیم سے کنارہ کشی کی پالیسی پر عملدرآمد کیا گیا۔ مسلمانوں میں ایک دوسرا طرز فکر بھی تھا کہ مسلمان بحیثیت قوم انگریزی حکومت سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ مسلمانوں میں انگریزی حکومت سے ٹکر لینے کی سکت نہیں رہی۔ مسلمان جدید علوم فنون سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنا قومی وجود برقرار نہیں رکھ سکتے۔

یہ طرز فکر سر سید احمد خان نے پروان چڑھایا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں یورپ کا سفر بھی کیا۔ وہاں کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی اداروں کا بغور مطالعہ کیا۔ انہوں نے یہ طے کیا کہ سیاسی میدان میں انگریزوں کے ساتھ مفاہمت کی پالیسی اختیار کی جائے اور عملی میدان میں جدید رجحانات کو اختیار کیا جائے۔

لندن میں قیام کے دوران سر سید نے وہاں کے نظام تعلیم کا بغور مطالعہ کیا انہوں نے جامعہ کیمبرج کا تفصیل سے معائنہ کیا کیوں کہ وہ ہندوستان میں واپس آکر مسلمانوں کے لیے دارالعلوم بنانے کا ارادہ کر چکے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ جو ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو گھاس پھونس کے نیم پختہ بنگلے میں شروع کیا گیا نومبر ۱۹۲۰ء میں عظیم جامعہ (University) کا روپ دھار چکا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کے مقاصد میں اگرچہ مسلمانوں کی تہذیب کو انگریزی تہذیب میں ضم کرنا نہیں بلکہ اسے انفرادی مقام دلانا اور ایسے نوجوان پیدا کرنا تھا جو زمانے کے تقاضوں کے مطابق شریعت کی حفاظت کر سکیں۔[21] لیکن دارالعلوم علی گڑھ کالج کے زمانے سے ہی سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جانے لگا۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے جو مسلمانوں پر طویل عرصے سے بند تھے وہ اب مکمل کھل چکے تھے اور اس

19-سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، (ادارہ اسلامیات لاہور)، ج ۱، ص ۱۴۲

20-برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، (خصوصی شمارہ مجلہ علم و آگہی گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی ۱۹۷۳-۷۸ء) ص ۴۷

21-ایضاً، ص ۸۰-۷۸

کے اثرات مسلمانوں پر یہ پڑے کہ معاشی بہبود اور مادی اغراض کا حصول ان کا مقصود و مطمح نظر بن کر رہ گیا۔ دینی، اخلاقی اور اخروی مقاصد پسِ پشت ڈال دیے گئے۔[22]

دارالعلوم ندوۃ العلما اور مدرسۃ الاصلاح کا قیام

دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے تعلیمی تصورات میں نمایاں بُعد پایا جاتا تھا جسے کم کرنے کے لیے مزید تجربات ہوئے جن میں دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر قابل ذکر ہیں۔ ندوۃ العلما کی تحریک مولانا سید محمد علی مونگیری نے ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے ایک سالانہ جلسہ میں اس مدرسہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کے موقع پر پیش کی۔ اس تحریک کے دو بنیادی مقصد تھے، پہلا رفع نزاع باہمی اور دوسرا اصلاح طریقہ تعلیم۔ ۲۶ ستمبر ۱۸۹۸ء کو خاتون منزل گولہ گنج لکھنؤ کے ایک وسیع مکان میں دارالعلوم کا افتتاح ہوا۔ دارالعلوم کے عمومی مقاصد کے علاوہ خصوصی طور پر ان مقاصد کو بھی مد نظر رکھا گیا جو اس تحریک کی بنیاد رکھنے کا سبب بنے۔ ان مقاصد میں رفع نزاع باہمی (قدیم و جدید کی تفریق ختم کرنا)، علمی و فکری مزاج کو فروغ دینا، اصلاح و ترقی نصاب دینی مدارس شامل تھے۔ علاوہ ازیں انگریزی زبان اور بقدر ضرورت جدید علوم کو نصاب میں داخل کرنا اور انہیں عربی علوم و فنون کے ساتھ پڑھانا بھی ان ہی مقاصد کا حصہ تھا۔[23]

ندوۃ العلما نے بڑی جدوجہد کے بعد ایک نیا نصاب تعلیم پیش کیا جس میں منطق و فلسفہ کو کمتر اہمیت دی گئی اور تفسیر و حدیث کو مناسب مقام دیا گیا۔ جدید اسلوب کے مطابق نئی کتب تحریر کرائی گئیں جن میں اسلامی روح جھلکتی ہے۔ عربی زبان کی تعلیم ایک زندہ زبان کی طرح دی جانے لگی۔ جدید علوم اور انگریزی علوم کا بھی انتظام کیا گای۔ ۱۸۹۸ء میں علما نے اصلاح شدہ نصاب قبول کر لیا اس طرح قدیم نصاب کی اصلاح کا دروازہ کھل گیا۔[24]

دارالعلوم ندوۃ العلما کی فکر سے ہم آہنگ ۱۹۰۹ء میں مدرسۃ الاصلاح کا سنگ بنیاد رکھا گیا، یہ درس گاہ سرائے میر مضافات اعظم گڑھ میں ایک چٹیل میدان میں قائم کی گئی تھی۔ ندوۃ العلما کے حالات سے دلبرداشتہ ہو کو علامہ شبلی نعمانیؒ بھی اسی مدرسہ میں آ گئے تھے۔ مدرسہ کے اغراض و مقاصد اور طریقہ کار کا ابتدائی خاکہ علامہ کا ہی مرتب کیا ہوا تھا۔ س مدرسہ کی صورت گری مولانا حمید الدین فراہی کے ہاتھوں ہوئی، اس ادارے میں علوم کا سرچشمہ قرآن حکیم کو قرار دے کر قدیم و جدید تمام علوم کو اس کی روشنی میں پڑھایا جاتا تھا۔ عربی زبان و ادب کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ قدیم و جدید علوم کی ترکیب صحیح توازن کے ساتھ پیش کی گئی اور اس پر عمل درآمد کر کے دکھایا گیا۔ اس نمونے پر ہندوستان میں بعد ازاں دیگر مقامات پر بھی درس گاہیں قائم ہوئیں۔[25]

22-سید محمد سلیمؒ، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ص ۲۷۴

23- برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، خصوصی شمارہ مجلہ علم و آگہی، ص ۱۰۴-۱۰۵

24- سید محمد سلیمؒ، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ص ۲۸۹

25-ایضاً، ص ۲۹۴-۲۹۵

تقسیم سے قبل برصغیر سے انگریز کے رخصت ہوتے وقت پورے برصغیر میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں دینی مدارس قائم ہو چکے تھے اور تقسیم کے بعد اس میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوا اور اب بھی مدارس کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

دینی مدارس کے نصاب میں ردوبدل

دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ دینی مدارس کے نصاب میں قرآن وسنت کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن وسنت اور اس سے متعلقہ علوم خواہ وہ عالیہ ہوں یعنی مقصود بالذات تفسیر و حدیث، فقہ و اصول یا علوم آلیہ یعنی ادب عربی، قواعد وانشاء، بلاغت و بیان، منطق و فلسفہ وغیرہ جملہ علوم و فنون اور ان کی شامل درسی کتب میں شروع سے ردّوبدل ہوتا آیا ہے۔ دینی مدارس کے نصاب میں شامل متون اور ان کی شروح اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ دینی مدارس میں رائج زیادہ تر کتابیں دور تدوین اور اس کے بعد کی یادگار ہیں۔

ایک طرف دینی مدارس بیرونی دباؤ کا شکار ہیں تو خود داخلی طور پر بھی مدارس میں نصاب کی تبدیلی کی بات زور شور سے جاری ہے۔ بیرونی عناصر جب دینی مدارس سے ان کی انتظامی و مالیاتی خود مختاری تک چھیننے کے درپے ہوں تو دینی مدارس کا ان بیرونی عناصر سے خواہ حکومتی ہی کیوں نہ ہوں محفوظ فاصلہ قائم رکھنا بالکل بجا بلکہ مدارس کے تحفظ کا عین تقاضا ہے۔ اب دینی مدارس کا اصل امتحان بیرونی دباؤ اور داخلی تقاضوں کے مابین بصیرت افروز نقطہ نظر اپنانے کا ہے۔ کیا ارباب دینی مدارس یہ کہہ کر چھوٹ سکتے ہیں کہ ہم خالصتاً مسجد و مدرسہ کے لیے امام وخطیب اور مدرسین تیار کر رہے ہیں اس لیے ہمیں اپنی توجہ خالص دینی علوم کی حد تک مرکوز رکھنی ہے۔ اگرچہ مشاہدہ یہ ہے اور اس رجحان میں دینی مدارس ایک دوسرے سے مسلسل آگے بڑھنے کے لیے کوشاں ہیں کہ انفرادی دائرے میں کئی دینی مدارس نہ صرف از خود عصری تعلیم کا انتظام کر رہے ہیں بلکہ کئی ایک مدارس نے باضابطہ عصری تعلیم کے مثالی ادارے قائم کر رکھے ہیں جہاں قرآن حکیم حفظ و ناظرہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ کیا یہ درست نہیں کہ اس وقت بعض مدارس تیزی سے فروغ پاتے غیر سودی بینکاری کے مشاورتی نظام کے لیے فعال کردار انجام دے رہے ہیں۔ عصری تعلیمی اداروں میں اعلیٰ سطح کی تعلیمی، تحقیقی، تدریسی اور انتظامی سرگرمیوں میں شمولیت کے علاوہ ملک کے کئی اداروں میں دینی مدارس کے فاضلین اپنی صلاحیتیں کھپانے میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ تمام مدارس کے مابین بغیر کسی ہم آہنگی اور منصوبہ بندی کے ہو رہا ہے اور اس سے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے دینی مدارس میں بھی طبقاتی نظام فروغ پا رہا ہے۔ بعض مدارس جو وسائل و مواقع کے اعتبار سے دیگر مدارس سے زیادہ مستحکم ہیں وہ اپنے طلبہ، فاضلین اور اساتذہ کے لیے بہتر مواقع، سہولیات اور پیشہ وارانہ خدمات کی انجام دہی کے میدان میں نمایاں رہتے ہیں جبکہ بالعموم دینی مدارس میں اس نوعیت کی سہولیات اور مواقع مفقود نظر آتے ہیں۔

تقسیم سے پہلے دینی مدارس نے جس کامیابی کے ساتھ انگریزی استعمار کا مقابلہ کیا ہے قیام پاکستان کے بعد دینی مدارس اس قدر کردار ادا کرنے سے بھی گریزاں ہیں۔ عصری تقاضوں کے مطابق جس رفتار کے ساتھ نصاب و نظام میں بہتری کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے دینی مدارس اس کے مطابق اجتماعی فیصلہ سازی اور اصلاحات کے اطلاق میں پیش رفت نہیں کر سکے ہیں۔

برصغیر میں جتنے تعلیمی تجربات ہوئے ان میں انگریزی زبان کی اہمیت مسلم رہی جس کی تدریس کے حق میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ [م ۱۸۲۴ء] نے فتاوی عزیزیہ میں فتویٰ دیا تھا۔[26] لیکن قیام پاکستان کے بعد اب تک دینی مدارس میں انگریزی زبان کی اجنبیت ختم نہ ہو سکی۔ مختلف سماجی علوم (Social Sciences) عمرانیات، سیاسیات، معاشیات، فلسفہ، نفسیات، بین الاقوامی تعلقات، قانون، ابلاغ عامہ نظم ونسق وغیرہ کے مبادیات تک سے دینی مدارس کے طلبہ ناآشنا رہتے ہیں۔ ان علوم کو عصری یا دنیاوی قرار دے کر ان سے گریز کی راہ اختیار کی جاسکتی ہے لیکن مدارس میں کئی متعلقہ علوم مثلاً سیرت وتاریخ، تقابل ادیان، عربی انشاء ومحادثہ اور جدید علم الکلام وغیرہ کو بھی ان کا جائز مقام نہ ملنا کسی لمحہ فکریہ سے کم نہیں۔ حالانکہ دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں مذکورہ بالا علوم ہی نہیں بلکہ طب کو بھی شامل نصاب کیا گیا تھا۔ اسی طرح ندوۃ العلماء کے نصاب میں اور اس کی تقلید میں مدرسۃ الاصلاح میں انگریزی، ہندی، جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات جیسے مضامین بھی نصاب کا حصہ تھے۔[27]

حکومتوں کے تعاون کے بغیر امداد باہمی کے اصول پر جس طرح دینی مدارس آج تک اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں اسی طرح وہ دفاعی پوزیشن اختیار کیے بغیر از خود اپنی طے کردہ حکمت عملی پر عمل درآمد کی پوری صلاحیت اور طاقت رکھتے ہیں۔

اصلاح نصاب کے سلسلے میں اسلاف کی فکر مندی اور ہمارا طرز عمل

قومی وبین الاقوامی سطح پر دینی مدارس گفتگو کا اہم عنوان بنے ہوئے ہیں اس حوالے سے دینی مدارس کے سنجیدہ حلقوں میں بھی ہر دور میں بحث ونظر کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ قبل از تقسیم استعماری قوتوں کے مقابلے میں ہمارے اسلاف کی فکر مندی اور مسلسل سوچ وبچار کے نتیجے میں مدارس میں اصلاح کا کام جاری رہا، نئی اسکیمیں متعارف کرائی گئیں۔ ستمبر ۱۹۱۰ء میں علامہ شبلی نعمانیؒ نے لکھا:

> ''یہ امر اگرچہ بدیہی ہے کہ قدیم تعلیم میں سخت اصلاح اور اضافہ کی ضرورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بڑے مقدس علماء اب تک اس ضرورت کے قائل نہیں۔ اس لیے ہم ان سے سوالات ذیل کے جوابات چاہتے ہیں: ۱۔ یورپ کے مصنفین مذہب پر جو حملہ کر رہے ہیں، اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ ۲۔ اگر علما خود ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے تو کیا خود ان مسلمانوں میں ان خیالات کا شائع ہونا کوئی روک سکتا ہے؟ ۳۔ مذہب پر عموماً اور مذہب اسلام پر جو اعتراضات یورپ کے لوگ کر رہے ہیں ان کا جواب دینا کس کا فرض ہے؟ ۴۔ علماء جب تک ان خیالات سے واقف نہ

26- سلیم منصور خالد، دینی مدارس میں تعلیم، آئی پی ایس اسلام آباد ۲۰۰۲ء، ص ۹۶
اس فتوے سے متعلق مولانا مناظر احسن گیلانیؒ قمطراز ہیں: شاہ عبدالعزیزؒ کے متعلق تو خیر سر سید احمد خان وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا تھا، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے فتاویٰ عزیزیہ میں ایسا کوئی فتویٰ نفیاً یا اثباتاً نہیں ہے مگر شاہ صاحب کے علاوہ دوسرے علما مثلاً حضرت مولانا عبدالحئ فرنگی محلیؒ کے فتاویٰ میں دیکھیے ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر آپ کو جواز کا فتویٰ ملے گا۔
27- سید محمد سلیمؒ، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ص ۳۰۲-۲۹۸، ۲۶۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ سید سلمان حسینی ندوی، ص ۲۲۱- ۲۲۸

ہوں گے جواب کیوں کر دے سکیں گے ؟۵۔ کیا علمائے سلف نے یونانیوں کا فلسفہ نہیں سیکھا تھا،اور ان کے اعتراضات کے جواب نہیں دیے تھے ؟۶۔ اگر اس وقت اس زمانے کا فلسفہ سیکھنا جائز تھا تو اب کیوں جائز نہیں ہے ؟''[28]

۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو علمائے دیوبند و سہارنپور پر مشتمل اصلاح نصاب کے لیے تشکیل دی گئی کمیٹی کے سامنے مولانا ابوالکلام آزادؒ نے صدارتی خطبہ میں بڑی دردمندی سے کہا تھا:

''جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے کہ عربی اور اسلامی علوم کی تعلیم جس ڈھنگ پر دی جارہی ہے اس کی اصلاح ہو۔۔۔ کیا واقعی ان اصلاحوں کی ضرورت ہے ؟ کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ جو حضرات مسلمانوں کی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں،اسلامی علوم کی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ رکھتے ہیں وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں ؟ ان کی ذمہ داریاں بہت ہیں۔ وہ نہ صرف ملک کے سامنے بلکہ تمام عالم اسلام کے سامنے جوابدہ ہیں۔ کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور عظیم الشان خدمت (اصلاح نصاب دینی) کو انجام دیں۔ اس خواب کو جو سو برس سے لوگوں نے دیکھا ہے اور جو آج تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوا ہے۔ کم از کم آج تو اس کی تعبیر عالم اسلام کے سامنے آئے''۔ حوالہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ مختلف نظام ہائے تعلیم کو آپس میں قریب لانے کے لیے جزوی تراش خراش کے بجائے تعلیم کے میدان میں حقیقی انقلاب برپا کرنے کی جانب متوجہ کیا۔ مولانا کے تصور تعلیم کا اظہار ان کے پیش کیے ہوئے دینی تعلیم کے معیار مطلوب سے ہوتا ہے۔[29]

مجلس تعلیمی منعقدہ دارالاسلام پٹھانکوٹ ۱۹۴۴ء کے اپنے خطبہ میں مولانا نے فرمایا: (دینی تعلیم کا معیار مطلوب یہ ہے کہ)

۱۔ قرآن اور حدیث میں اتنی محققانہ نظر کہ طالب علم زندگی کے مختلف مسائل میں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ سے رہنمائی حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔

۲۔ فقہ اسلامی سے اتنی واقفیت کہ طالب علم مذاہب فقہیہ کے اصول استنباط اور ان کے دلائل اور حجتوں سے واقف ہو جائے

۳۔ معقولات قدیمہ سے اتنی واقفیت کہ طالب علم قدما کی کتابوں سے استفادہ کر سکے اور معقولات جدیدہ سے اتنی واقفیت کہ موجودہ دور کے علمی پس منظر کو اچھی طرح سمجھ سکے۔

۴۔ علوم اجتماعی سے اتنی واقفیت کہ طالب علم موجودہ دور کے تمدنی مسائل اور تمدنی تحریکوں کو ناقدانہ حیثیت سے اچھی طرح سمجھ سکے۔

۵۔ تاریخ عالم پر اجمالی نظر، عہد نبوت اور خلافت راشدہ کی تاریخ اور ہندوستان اور یورپ کی جدید تاریخ سے خصوصی واقفیت۔[30]

28-سید سلیمان، مقالات شبلی، (نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان)، جلد سوم ص ۱۳۸

29-حافظ حقانی میاں قادری، ڈاکٹر، دینی مدارس، نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے، (فضلی سنز کراچی ۲۰۰۲ء)، ص ۵۳۸

30- مولانا سید ابوالاعلی، مودودی، تعلیمات،ؒ (اسلامک پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۲ء)، ص ۱۱۶

مولانا کا پیش کردہ معیار مطلوب دینی نظام تعلیم میں انقلابی تبدیلیوں کا متقاضی ہے۔ معیار مطلوب کے مطابق معقولات قدیمہ کے ساتھ معقولات جدیدہ کی پوری واقفیت ،علوم اجتماعی کی مکمل آگاہی اور دنیا کی جدید و قدیم تاریخ سے واقفیت اور ان کے حوالے سے طلبہ میں تنقیدی نظر پیدا کرنا ایک دو کتب کے اضافے سے ممکن نہیں اس کے لیے پورے نظام تعلیم میں مثبت اور دور رس اصلاح کی ضرورت ہے۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے بانی مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے اس مسئلے پر اظہار خیال ان الفاظ میں کیا:

> ''عربی مدارس کے نصاب تعلیم کی تجدید و ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے، اس لیے نہیں کہ وہ اپنے زمانے میں کافی نہ تھا یا صحیح استعداد پیدا کرنے سے قاصر تھا، بلکہ مزید علوم جدیدہ یا معلومات عامہ حاصل کرنے کی ضرورت ہے، وقت کے تقاضے بدل گئے ہیں، طبیعتوں کے سانچے بدل گئے، اذواق و افکار میں فرق آ گیا، عبارتی دقت اور موشگافی کے لیے ان مزاجوں میں صلاحیت نہیں رہی''۔[31]

مولانا بنوریؒ نے دینی مدارس میں تخصص کے رجحان کو فروغ دینے کے لیے مختلف کلیات (Faculties) کا تذکرہ بھی کیا ہے اور مدارس کے اس اصلاحی پیکج اور اس کو اختیار نہ کرنے کی صورت میں اپنے خدشات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''اس ماحول میں اگر ہم اب بھی ان غیر اہم مسائل پر جمے رہیں گے تو علوم اسلامیہ سے (عوام الناس کی) توجہات ہٹ جائیں گی اور ہمارا یہ طرز عمل اکابر و اسلاف کی اس تراث فاخرہ اور اس علمی ثروت و سرمایہ کو فنا کے گھاٹ اتار دے گا۔۔۔''[32]

ارباب دینی مدارس کے لیے مولانا بنوریؒ کے یہ الفاظ ''ہمارا یہ طرز عمل اکابر و اسلاف کی اس تراث فاخرہ اور اس علمی ثروت و سرمایہ کو فنا کے گھاٹ اتار دے گا'' کیا کافی نہیں اور اس سے یہ حقیقت بھی طشت از بام ہوتی ہے کہ ہمارے ذہنوں میں ان اکابرین و اسلاف کی عقیدت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اس کے باوجود ہم نے دینی مدارس کے نصاب و نظام میں اصلاح کی خاطر ان کی دی ہوئی رہنمائی کو حسب منشا توجہ نہیں دی اور نہ ان کے خدشات کا کوئی اثر لیا۔ چند جزوی تبدیلیوں اور حکومتی دباؤ میں آ کر میٹرک تک عصری مضامین کا اضافہ کر کے اسلاف کے نظریات کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔

اصلاح نصاب کے لیے مدارس کا لائحہ عمل

اصلاح نصاب کے لیے مدارس کا لائحہ عمل اور حکمت عملی کے دو اہم پہلو ہیں۔

ایک پہلو مدارس میں رائج نصاب درس میں اصلاح اور جزوی ترمیم و تغیّر ہے جس سے دینی مدارس اپنے مقاصد و اہداف کے حصول میں زیادہ بہتر نتائج دے سکیں۔ یہ ایک تفصیل طلب پہلو ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ اس کے چند قابل عمل امور کی نشاندہی پر اکتفا کریں گے۔

31-مولانا انور بدخشانی، انتخاب مقالات مولانا بنوریؒ، دینی مدارس کی ضرورت اور جدید تقاضوں کے مطابق نصاب و نظام تعلیم، (بیت العلم کراچی ۲۰۰۰ء)، ص ۹۸

32-ایضاً صفحہ ۱۰۷

دوسرا پہلو یکساں نصاب تعلیم کے لیے کوششوں کے آغاز سے متعلق ہے۔ اگرچہ یہ حکومتی سطح کا کام ہے لیکن دینی مدارس ہی اس کے راہ ہموار کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ عام تعلیمی نصاب اور اداروں پر تو مغربیت کی چھاپ مزید گہری ہوتی جا رہی ہے اور ان میں دینیات کا شعبہ محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا ہے اس لیے جس طرح دینی مدارس عصری تعلیم کے ادارے بھی قائم کر رہے ہیں ایسے ہی دینی مدارس کو پاکستان میں یکساں نصاب تعلیم کے لیے زیادہ بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے۔

دینی مدارس اپنی حکمت عملی کے مطابق پیش رفت کا آغاز رائج نصاب کی تشکیل جدید سے کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے دینی مدارس میں زیر درس جملہ مضامین کے عصری تقاضوں اور ضروریات سے ہم آہنگ عمومی اور مرحلہ وار مقاصد کا تعین کرنا ضروری ہے۔ مقاصد کا تعین کرتے وقت موجودہ دور میں درکار استعداد اور مہارتوں (Skills) کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ ان مقاصد کی روشنی میں رائج کتب کو از سر نو مرتب (Re-Write) کیا جا سکتا ہے۔ اور نئی کتب کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے جو برصغیر سمیت عرب دنیا میں نئے اسالیب کے مطابق تیار کی گئی ہیں۔ فنون کی تدریس میں مغلق اور پیچیدہ عبارتوں پر مشتمل کتب، متون، ان کی شروح اور شرح الشروح کی جگہ ایسی کتب زیادہ مؤثر اور مفید ثابت ہو سکتی ہیں جس کے ذریعے بآسانی متعلقہ فن کے اصولوں کی تفہیم، اطلاق اور تطبیق بروئے کار لائی جا سکتی ہو۔

مقاصد نصاب کے تعین میں یہ بھی ضرور پیش نظر رکھا جائے کہ مدارس میں داخل ہونے والا ہر طالب علم لازماً عالم دین (درس نظامی کا فارغ التحصیل) نہیں بنتا۔ اس لیے مدارس کی تعلیمی اسکیم میں اتنی گنجائش تو ضرور ہونی چاہیے کہ ہر طالب علم اپنی استعداد اور دستیاب وقت و فرصت کے مطابق دینی تعلیم سے استفادہ کر سکے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شروع سے نصاب کے تین مراحل تشکیل دیے گئے تھے۔ درجہ ادنیٰ: ان درجات کی خواندگی تین سال رکھی گئی جس میں قرآن مجید، حدیث، فقہ اور علم کلام (عقائد) کی بنیادی واقفیت پیدا ہو۔ درجہ متوسطہ: اس کی مدت خواندگی پانچ سال، ان لوگوں کے لیے جو علوم و فنون میں مرتبہ فضیلت حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ درجات تکمیل: اس سے مقصود دقت مطالعہ کے ساتھ مسائل کا استیعاب اور تبحّر علمی پیدا کرنا ہے۔[33]

اسی طرح مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے مدارس کے نصاب کی مقاصد کے اعتبار سے تین طرح کی تقسیم تجویز کی۔ اس کے مطابق ایک مدرس عالم کا نصاب، دوسرا ماہر خصوصی کا نصاب اور تیسرا صرف دینی ضرورت کے لیے عالم بننے کا نصاب۔[34]

مولانا نے مزید برآں دینی مدارس کے نصاب میں ترمیم و اصلاح کا سہ نکاتی پیکج دیا ہے جس کے مطابق سابقہ نصاب میں تخفیف کی جائے تاکہ نصاب کی تکمیل میں اتنا عرصہ نہ لگے جتنا اب لگ رہا ہے، نصاب میں شامل پیچیدہ و دقیق کتب کی جگہ سہل کتابیں شامل کی جائیں نیز بعض غیر اہم فنون کو حذف کر کے جدید اور مفید علوم کا اضافہ کیا جائے۔ اس کے

33- سلمان حسنی، سید، ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟، ص ۱۶۸

34- مولانا انور بدخشانی، انتخاب مقالات مولانا بنوریؒ، دینی مدارس کی ضرورت اور جدید تقاضوں کے مطابق نصاب و نظام تعلیم، ص ۱۰۵

علاوہ مولانا نے دینی مدارس میں تخصص کے رجحان کو فروغ دینے کے لیے مختلف کلیات مثلاً کلیہ اصول الدین، کلیۃ الشریعۃ اور کلیۃ الادب اور ہر کلیہ کے تحت تخصص کے مزید شعبے بھی تجویز کیے ہیں۔[35]

مدارس میں رائج علوم و فنون کی تشکیل و تدوین جدید کا ایک اہم مرحلہ مدارس میں جدید طرق تدریس کا فروغ ہے۔ جدید طرق تدریس اور تدریسی ٹیکنالوجی کی ترویج کے لیے تربیت اساتذہ اور تدریب المعلمین کے پروگرام کا دینی مدارس میں اجراء ضروری ہے جس کے مطابق ہر نئے مدرس کے لیے اس پروگرام سے گزرنا لازم قرار دیا جائے۔ دینی مدارس کے جملہ بورڈز کے نمائندگان کے ایک اجلاس باہتمام مجلس فکر و نظر لاہور ۶ فروری ۲۰۰۱ء میں ایسی کئی اصلاحات اور ترامیم کو متفقہ سفارشات کے طور پر منظور کیا گیا تھا۔[36]

قیام پاکستان کے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے تعلیم کی ثنویت اور تفریق کو مٹا کر اسلامی ریاست کے لیے تجویز کیا:

> ''ہمیں ایک ایسا نظام تعلیم قائم کرنے کی فکر کرنی چاہیے جس سے بیک وقت دین و دنیا کے عالم تیار ہوں، جس سے نکلنے والے بریک کی جگہ نہیں بلکہ امت کی گاڑی کے ڈرائیور کی جگہ سنبھالنے کے قابل ہوں اور اپنے اخلاق و کردار کے اعتبار سے بھی اور ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی مغربی طرز کے نظام تعلیم سے فارغ ہونے والوں کی نسبت فائق تر ہوں''۔[37]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے مسلم ممالک کے لیے الجامعہ الاسلامیہ (Islamic University) کا خاکہ پیش کیا۔ اس یونیورسٹی کا دائرہ کار ان لفظوں میں بیان کیا:

> ''اس کو اپنا دائرہ کار صرف علوم اسلامیہ تک محدود رکھنا چاہیے۔ دوسرے علوم اس میں اس حیثیت سے پڑھائے جائیں کہ وہ علوم اسلامیہ کے مددگار ہوں نہ اس حیثیت سے کہ اس یونیورسٹی کو ان علوم کے ماہرین تیار کرنے ہیں''۔[38]

خلاصۂ بحث

۱۔ عہد رسالت مآب ﷺ میں یکساں نظام تعلیم، مختلف علوم و فنون، زبانوں، مہارتوں (Skills) اور تخصصات کے فروغ کے لیے اقدامات کیے گئے۔

۲۔ مسلمانوں کے کئی صدیوں پر محیط دور عروج میں یکساں نظام تعلیم رائج تھا اور دین و دنیا کی ہر قسم کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ایک ہی تعلیمی نظام تھا۔

۳۔ جامعہ نظامیہ بغداد اور اس کے تسلسل میں پورے عالم اسلام بشمول برصغیر پاک و ہند میں دین، معاشرت، حکمت و فلسفہ اور ادب سے متعلقہ جملہ علوم کے ماہرین ایک ہی نظام تعلیم سے تیار ہوتے تھے۔

35-ایضاً ص ۱۰۳-۱۰۴

36-محمد امین، ڈاکٹر، ہمارا دینی نظام تعلیم، (دار الاخلاص برائے تحریک اصلاح تعلیم لاہور، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۱۷-۱۱۸

37-مولانا سید ابوالاعلیٰ، تعلیمات، ص ۱۶۶-۱۶۷

38-ایضاً، ص ۱۶۸

۴۔ برصغیر میں برطانوی استعمار سے قبل رائج درس نظامی دین و دنیا کا جامع نصاب تھا جس کی وجہ سے معاشرہ طبقاتی تفریق و تقسیم سے محفوظ تھا۔

۵۔ برصغیر میں انگریزوں نے صدیوں سے رائج مسلمانوں کے یکساں نظام تعلیم کو ختم کر کے اپنا نظام نافذ کیا۔ منظم طریقے سے مدارس سے لوگوں کو بد ظن کر کے مدارس کے ذرائع آمدنی مسدود کر دیے گئے اور فارغ شدہ طلبہ پر روزگار کے دروازے بند کر دیے گیے۔

۶۔ برطانوی استعمار کے مقابلے کے لیے مسلمانوں نے جو تجربات کیے ان میں دارالعلوم دیوبند، مدرسۃالعلوم علی گڑھ، ندوۃالعلماء لکھنؤ اور مدرسۃالاصلاح سرائے میر شامل ہیں۔

۷۔ دینی مدارس کے نصابِ درس میں مختلف ادوار میں ردوبدل کیا جاتا رہا ہے۔ نصاب و نظام میں تبدیلی کے رجحانات میں تمام مدارس کی یکساں شمولیت اور اصلاح طلب پہلوؤں پر فوری توجہ کی ضرورت ہے (زیر نظر مقالے میں علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے فرمودات کے ساتھ چند اصلاح طلب، پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے)

۸۔ مدارس کے نصاب و نظام کی اصلاح دو پہلو سے کی جاسکتی ہے:

(الف) رائج نصاب کی تشکیل جدید

(ب) یکساں نظام تعلیم کے فروغ کے لیے اقدامات